© rasailojaraid.com

ڈاکٹر محمد سلیم اختر*

ڈاکٹر سید اختر امام کے چند نو دریافت خطوط

ڈاکٹر سید اختر امام ۱۹۱۰ء میں پٹنہ کے نزدیک سرائے پرس رائے کے مقام پر بہار کے ایک انتہائی مقتدر خاندان میں پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالتے ہی انھیں علی گڑھ بھیج دیا گیا اور ابتدا سے ایم اے عربی تک ان کی ساری تعلیم وہیں انجام پائی۔ ۱۹۳۶ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے۔ ۱۹۳۹ء میں جنگِ عظیم دوم کے آغاز سے چند روز قبل جرمنی کی بون یونیورسٹی[1] سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر واپس وطن لوٹے اور کلکتہ یونیورسٹی سے بحیثیت استاد وابستہ ہو گئے جہاں انھوں نے چار سال تک تدریس کے فرائض انجام دیے۔ ۱۹۴۴ء میں انھیں یونیورسٹی آف سیلون میں شعبۂ عربی کی صدارت کی پیش کش ہوئی جو انھوں نے قبول کر لی۔ تقسیمِ ہند کے وقت وہ وہیں سیلون ہی میں تھے جب کہ ان کا سارا خاندان بہار سے کراچی منتقل ہو گیا۔ ۱۹۵۱ء میں انھوں نے بھی کراچی آ کر پاکستانی وزارتِ خارجہ میں ملازمت اختیار کر لی۔ ان کی پہلی تعیناتی بحیثیت سفارت کار بغداد میں ہوئی۔ اس کے بعد وہ تقریباً دس برس تک بہ ترتیب نیروبی، برسلز، منیلا اور جکارتہ میں سفارتی ذمے داریاں انجام دیتے رہے۔ ۱۹۶۰ء میں انڈونیشیا میں اپنی تعیناتی کے دوران انھوں نے پاکستانی وزارتِ خارجہ سے استعفا دے دیا اور واپس سیلون جا کر درس و تدریس کے پیشے سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۷۸ء میں وہ بلحاظِ عمر پیرادینیہ یونیورسٹی[2] سے ریٹائر ہو گئے لیکن جز وقتی تدریس کا سلسلہ پھر بھی جاری رہا۔ ۱۹۹۳ء میں کسی سیمینار کے سلسلے میں پاکستان آئے ہوئے تھے کہ کراچی میں قیام کے دوران بہ سن ۸۳ سال پیامِ اجل آن پہنچا اور 'پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا' کے مصداق ہمیشہ کے لیے یہیں پیوندِ خاک ہو گئے۔

خود رفتہ ایم و کنجِ مزاری گرفتہ ایم
تا بار دوشِ کس نشود استخوانِ ما

ڈاکٹر سید اختر امام ممتاز اردو شاعر اور منفرد ادیب و نقاد شمس العلماء خان بہادر سید امداد امام اثر (۱۸۴۹ء-۱۹۳۴ء)[3] کے بھتیجے سید وصی امام بن نواب سید یوسف امام کے بیٹے تھے؛ اس ناتے سے اختر امام کے والد حضرت علامہ اقبال کے ممدوح، سید علی امام (۱۸۶۹ء-۱۹۳۳ء)[4] اور موخر الذکر کے برادرِ خرد سید حسن امام (۱۸۷۱ء-۱۹۳۳ء)[5] کے حقیقی عم زاد تھے۔ اختر امام اس اعتبار سے بڑے خوش نصیب واقع ہوئے تھے کہ انھیں نہ صرف اپنے بڑے دادا بلکہ ان کے دونوں نامور فرزندوں کو بڑے قریب سے دیکھنے اور ان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ وہ اپنے بڑے دادا کے زبردست مداح تھے اور انھیں ہر لحاظ سے اپنے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ سمجھتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ دونوں کے درمیان بہت سی باتیں مشترک بھی تھیں، یہ الگ بات ہے، وجوہات کچھ بھی ہوں، اختر امام اپنی بے پناہ خداداد صلاحیتوں سے اس فائدے کا عشر عشیر بھی نہ اٹھا سکے جو ان کے بڑے دادا کی شناخت تھا یا جو استاد عبدالعزیز میمن (۱۸۸۸ء-۱۹۷۸ء) کے شاگرد ہونے کے حوالے[6] سے خود ان کے بعض خواجہ تاشوں کے حصے میں آیا۔ بہر حال، قابلِ تحسین ہیں ان کے بھائی ڈاکٹر سید قیصر امام جنھوں نے مرحوم کے منتشر خطوط، پراگندہ مقالات اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

موصوف کے بارے میں احباب کی یادداشتوں کو بڑی محنت، جاں فشانی اور سلیقے سے ''مکتوباتِ اختر امام''[۷] کی صورت میں سامنے لاکر ان کی یاد کو طاقِ نسیاں سے اتار کر ایک دفعہ پھر تاریخ ادبیات اردو کے دھارے میں ڈال دیا ہے۔

خطوط نویسی میں سید اختر امام کا اسلوب کچھ ایسا منفرد تھا کہ اگر یہ کہا جائے کہ، ع

جامہ ای بود کہ بر قامت او دوختہ بود

تو بے جا نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ کئی دفعہ ان کے مکتوب الیہ، مکاتیب کے ملتے ہی انھیں افادہ عموم کی خاطر شائع کر دیتے،[۸] یا دوبارہ، سہ بارہ ان سے محظوظ ہونے کے لیے سنبھال کر رکھ لیتے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج جو کچھ مختصراًن کی نگارشات ہماری دسترس میں ہیں وہ بھی دستبردِ روزگار کا شکار ہو کر رہ جاتیں۔

معروف مصنف، ادیب، دانشور، مؤرخ، نقاد، دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ناظم اور اس کے ماہ وار علمی مجلّہ ''معارف'' کے صاحب نظر مدیر، سید صباح الدین عبدالرحمٰن (۱۹۱۱ء-۱۹۸۷ء)، سید اختر امام کے نہ صرف ہم وطن بلکہ دیرینہ دوست اور محبوب مکتوب الیہ بھی تھے۔ ان کے نام بلجیم سے آئے ہوئے اختر امام کے تین خطوط جو پہلے معارف (جلد ۸۱، نمبر ۶، دسمبر ۱۹۵۷ء، ص ۴۶۸-۴۷۶) میں ''برید فرنگ: بلجیم سے ایک عزیز دوست کے چند خطوط'' کے زیر عنوان چھپ چکے تھے، مکتوبات اختر امام (ص ۴۳-۴۹) کی زینت ہیں، لیکن معارف ہی میں مطبوعہ اس سے پہلے کا سیلون سے لکھا ہوا ایک خط (جلد ۵۷، نمبر ۶، جون ۱۹۴۶ء، ص ۴۶۸-۴۷۱)، اور برسلز (جلد ۸۱، نمبر ۵، مئی ۱۹۵۸ء، ص ۳۹۰-۳۹۴)، ماسکو (جلد ۱۱۳، نمبر ۶، دسمبر ۱۹۷۳ء، ص ۴۷۲-۴۷۵) اور سری لنکا (جلد ۱۱۳، نمبر ۵، مئی ۱۹۷۴ء، ص ۳۸۸-۳۹۷) سے بہ ترتیب موصول شدہ تین خطوط، اور اسی طرح نومبر ۱۹۸۷ء میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی ٹریفک کے ایک حادثے میں ناگہانی طور پر جان بحق ہو جانے پر، اختر امام کا مدیر معارف کے نام تعزیتی خط (جلد ۱۴۱، نمبر ۱، جنوری ۱۹۸۸ء، ص ۶۲-۶۳) ڈاکٹر سید قیصر امام صاحب کی نظروں سے اوجھل رہ گئے تھے جنھیں اب ضروری حواشی کے ساتھ ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے تاکہ مکتوبات کی آئندہ اشاعت میں شامل ہو سکیں۔

(۱)

سیلون کے مسلمان

از ڈاکٹر اختر امام ایم اے علیگ، پی ایچ ڈی (بون)، صدر شعبہ عربی، کولمبو یونیورسٹی ''حال ہی میں یہ خط موصول ہوا ہے۔ اس میں سیلون کے مسلمانوں کے متعلق بعض مفید معلومات ہیں، اس لیے ناظرین معارف کی آگاہی کے لیے اس کو شائع کیا جاتا ہے۔'' (م)

اگست ۱۹۴۴ء سے یہاں ہوں اور کام کر رہا ہوں۔ پیسوں کے اعتبار سے چنداں بری جگہ نہیں ہے۔ فطرت کے حسین نظارے، شاداب گھاٹیاں، جنگلوں کی گھنی چھاؤں میں چشموں کی چمک اور وہ تمام اسباب مہیا ہیں جو ایک مشرقی مزاج چاہتا ہے۔ کمی ہے تو صرف ایک چیز کی اور وہ یہ ہے، ہجوم میں ذہنی تنہائی کی۔

یہ ذہنی جلاوطنی پہلے مجھے کھائے جاتی تھی مگر علمی پرچوں اور محشر خیال نے اس کی تلافی کافی حد تک کر دی ہے۔ اردو جاننے والوں سے یہ دنیا بالکل خالی ہے۔ بمبئی کے تاجروں سے ہندوستانی بول لیتا ہوں اور وہ بھی گاہے ماہے، اور یہ بھی خاص کر کولمبو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں، مضافات اور دوسرے شہروں میں اتنا بھی نہیں ہے۔ انگریزی بولتا ہوں اور چھری کانٹوں سے کھاتا ہوں۔ بات بات میں وہی مغربی ظاہرداریاں، شکریہ، افسوس، نقلی تبسم اور مصنوعی حزن،

کیا کم ہیں مغربی مدنیت کے فتوحات

کولمبو سمندر کے کنارے واقع ہے اور میری کوٹھی سے چند قدم پر بحر ہند کی موجیں سراندیپ کے ساحل سے ٹکراتی رہتی ہیں۔ سورج ڈوبتے وقت افق سے لے کر ساحل تک گلنار بن جاتا ہے۔ پانی کے کنارے ناریل کے جھنڈ جو تیز سمندری ہواؤں میں جھومتے رہتے ہیں، اور ملاحوں کے گیت، میں دور تک اپنے خیال میں گم ٹہلتا چلا جاتا ہوں۔ جب تھکن محسوس ہوتی ہے تو کسی چٹان پر بیٹھ جاتا ہوں۔ جی بہلانے کے لیے غالب کے شعر گنگنانے لگتا ہوں۔ جب اندھیرا چھا جاتا ہے اور آسمان پر ستارے چمکنے لگتے ہیں تو ربر اور ناریل کے باغوں سے گذرتا ہوا اپنی قیامگاہ کو آ جاتا ہوں۔

میری زندگی یہاں ہندوستان سے بالکل مختلف ہے۔ درسی کاموں کے بعد جو وقت بچ رہتا ہے وہ اسلامی انجمنوں کی لکچربازیوں میں صرف ہوتا ہے۔ جزیرہ کے مسلمان مجھ سے محبت کرتے ہیں، ایسی ہی محبت جو علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ العالی[9] کی ذات گرامی سے مجھ فقیر کو ہے۔ تقریباً ساٹھ لاکھ جزیرہ کی آبادی ہے جس میں ۶ لاکھ مسلمان ہیں۔ ان مسلمانوں میں اکثریت ان مسلمانوں کی ہے جن کے آبا و اجداد عرب ملاح تھے اور جو یا تو براہ راست عرب سے یا مالابار اور کورومنڈل سے پھیلتے اور تجارت کرتے ہوئے یہاں آ کر آباد ہو گئے، بقول اقبال:

بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

ان کی زبان تمل ہے اور رسم و رواج پر عربیت کا کافی اثر ہے۔ اناج اور جواہرات کی منڈیاں ان کے ہاتھوں میں ہیں اور سب کے سب تجارت پیشہ ہیں۔ شکر ہے کہ اپنی اقتصادی روایات کو انھوں نے برقرار رکھا ہے ورنہ مسلمان زمینداروں کی طرح تباہ حال رہتے۔

جزیرہ میں اکثریت بودھ مت والوں کی ہے لیکن ان کی بولی میں عربی الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں، میں انھیں جمع کر رہا ہوں۔

مسلمان آبادی کو تین طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ مسلمان جو خود کو اب تک (Ceylone[se] Moors) کہتے ہیں، دوسرے شمالی حصہ کے ٹاملی مسلمان جن کے بزرگ کورومنڈل اور مالابار کے ساحلی علاقوں سے تجارت کے سلسلہ میں یہاں آباد ہو گئے، اور تیسرے، بہت ہی کم تعداد میں بمبئی کے بورے،[10] میمن اور خوجے ہیں۔

دولت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، مذہب کی گرمی اب تک باقی ہے، ضرورت ہے کہ ان چنگاریوں کو پھونک کر اور دہکایا جائے۔ میں تقریر اور تحریر کے ذریعے یہ کام کرتا رہتا ہوں۔

ہندوستانی تجارت پیشہ مسلمانوں کے علاوہ باقی سب کے سب مسلمان شافعی المذہب ہیں۔ قادریہ اور شاذلیہ طریقوں کا بڑا زور ہے۔ پچھلے دنوں ''قادریہ ایسوسی ایشن'' میں اسلام پر تقریر کرنے کے لیے گیا تھا۔ تقریباً ہر شہر میں اس کی ایک شاخ موجود ہے۔ ربیع الاوّل کا مہینہ یہاں کی مذہبی سرگرمیوں کا مہینہ ہے۔ اس کا اس سے اندازہ کیجیے کہ جزیرہ کے مختلف حصوں سے میرے پاس پچپن دعوت نامے سیرت نبیؐ پر تقریر کے لیے آئے تھے۔ ظاہر ہے کہ آئنسٹائن[11] تو تھا نہیں جو زمان و مکان کو سمیٹ کر تحلیل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کردیتا، کل پانچ جگہ گیا، تقریر کی، اور اس شیریں احساس کے ساتھ لوٹا کہ اسلام ابھی زندہ ہے، اور اس کی اندرونی لہروں میں ابھی تک زور ہے۔ مسلمانوں کی زبان تمل ہے۔ یہ جنوبی ہندوستان کا اثر ہے، کیونکہ ان کے اجداد وہیں کے ساحلی مقامات سے آئے تھے۔ میں انگریزی میں تقریریں کرتا ہوں۔ اس زبان کے سمجھنے والوں کے [کی] تعداد زیادہ ہے۔ مضافات میں ترجمان ہر پانچ پانچ منٹ کے وقفہ کے بعد ٹامل میں ترجمہ کرتا جاتا ہے۔

رات (The Library Movement) پر ایک انجمن میں تقریر کی، اسلامی دنیا کے مشہور علمی محسن خدا بخش[۱۲] کو نہ بھولا، دو گھنٹوں تک یہ سلسلہ قائم رہا۔

مسلمان عورتوں میں بہار کی طرح سخت پردہ ہے۔ تعلیم نسواں کا وہی حال ہے جو بہار کی نسوانی دنیا میں ہے۔ وہاں دعائے گنج العرش، درود تاج اور نور نامہ یا بہشتی زیور ہے، تو یہاں سے سبحان مولود، غوث اعظم اور ٹامل زبان میں چند مذہبی دعائیں ہیں، بس، کیسی تاریخ اور کیسا جغرافیہ؟

(۲)

برید فرنگ

برسلز

۸ر فروری ۵۸ء

مجی صباح الدین صاحب سلام ورحمت

ہلکی ہلکی برفباری ہو رہی ہے اور میں نیم شب کے سناٹے میں بیٹھا ہوا یہ خط لکھ رہا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ دن کے وقت کیوں نہیں لکھا؟ شب بیداری تو درویشوں کا مسلک ہے یا پھر یہ لمحات اہل نشاط کو زیادہ محبوب ہوتے ہیں، اور میں نہ صوفی ہوں اور نہ مرزا غالب کی طرح اس کا دعویٰ کرسکتا ہوں کہ

صاف دود کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ

بات یہ ہے کہ باوجود سنجیدگیوں کے ایک لاابالی انسان ہوں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی مجلس سے لوٹا اور نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ تلاوت شروع کردی یا پھر طلوع سحر سے پہلے جب کہ سکون کا عالم ہوتا ہے، حواس مجتمع ہوتے ہیں تو دیوان حافظ لے کر پڑھنا شروع کردیتا ہوں، حالانکہ اکبرالہ آبادی نے اپنے مخصوص طنزیہ لہجہ میں متنبہ بھی کردیا تھا:

ہم میں باقی نہیں اب خالد جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظ شیراز کا رنگ

جب دفتر جاتا ہوں تو کاموں کا ہجوم ہوتا ہے، جب اس دنیا سے نکلتا ہوں تو پھر شام کے وقت کسی مجلس میں شرکت کا خیال آتا ہے۔ اس طرح فرصت ہی نہیں ملتی کہ اطمینان سے بیٹھ کر آپ جیسے مخلص دوست سے مخاطب ہوسکوں، اس لیے سونچا [سوچا] کہ کل تو اتوار ہے، کیوں نہ اسی وقت چند سطریں لکھ ڈالوں۔ یہ ہے شانِ نزول اس عریضہ کی! ہاں، معارف کا شکریہ تو ادا کرنا بھول ہی گیا، آپ نے ہمارے چند خطوط[۱۳] شائع کرہی ڈالے مگر

میرے پتہ سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں نے جب اپنے خطوط کو پڑھا تو بے ساختہ ہنسی آئی۔ دیر تک سونچتا [سوچتا] رہا کہ آخر ان خرافات میں آپ کو کون سی کرن نظر آئی جسے آپ نے معارف کے افق پر پھیلانا مناسب سمجھا۔ معارف اردو زبان کا ایک علمی رسالہ ہے، بلند پایہ اور باوقار اور ہماری تحریر میں وحشت کے سوا اور کچھ ہوتا ہی نہیں ہے۔ پھر خیال آیا کہ شاید یہی آشفتہ بیانی آپ کو پسند آگئی ہو۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو زبان میں معیاری خطوط بہت ہی کم ہیں۔ یوں ہمارے ادیبوں نے اپنے خطوط بڑی آب وتاب سے شائع کیے، ان پر تقریظ بھی لکھوائی، مگر مرزا غالب اور مولانا ابوالکلام آزاد[۱۴] کے سوا اور کوئی اہل قلم معیار پر پورا نہیں اترا۔ دونوں کے ہاں بے پناہ انفرادیت ہے، تحلیلِ نفسی ہے اور انداز بیان میں شخصیت اپنی تمام تابناکیوں کے ساتھ جھلکتی ہے۔ پھر یہ بھی ایک مسلمہ بات ہے کہ ان دونوں ہستیوں نے خطوط اس لیے نہیں لکھے کہ ان سے شہرت میں اضافہ ہو۔ مغربی زبان میں خصوصاً فرانسیسی میں خطوط نویسی خود ایک مستقل ادبی موضوع ہے اور اس فن میں جو شہپارے آپ کو نظر آئیں گے ان سے ان کے بلند پایہ ادب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہمارے متقدمین علماء جنھوں نے کوفہ، بغداد، بصرہ اور قرطبہ میں ادبی چراغ روشن کیے، ان کے کارناموں کا جائزہ لیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں سے بیشتر نے اپنی کتاب کی ابتداء کسی عزیز دوست کے خط کے جواب سے کی ہے۔ مثلاً الجاحظ[۱۵] کو دیکھیے جس نے دوستوں کے نام کتابی خطوط لکھ ڈالے تھے۔ تونس کے مایۂ روزگار ابن رشیق[۱۶] اور اسی طرح قرطبہ کے مصنفین نے یہی طرزِ عمل اختیار کیا تھا، جاحظ کی جو تصویر دار الکتب المصریہ نے شائع کی تھی، اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ قسم کا انسان تھا، حالانکہ اس میں جو زندہ دلی تھی، وہ ہمارے خسرو اور غالب ہی کے یہاں آپ پائیں گے وہ جاحظ جس کے بارے میں ابن خلدون[۱۷] نے کہا تھا کہ "ہم کالجوں میں اپنے اساتذہ سے سنا کرتے تھے کہ اصول ادب اور اس کے ارکان سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے چار کتابوں کا پڑھنا از بس لازمی ہے یعنی جاحظ کی کتاب البیان والتبیین[۱۸]، بوعلی قالی بغدادی[۱۹] کی الامالی، المبرد[۲۰] کی الکامل، اور ابن قتیبہ[۲۱] کی ادب الکاتب، اور ذرا اس کی شوخی ملاحظہ ہو کہ جب سلام بن یزید الاندلسی دشوار گذار منزلیں طے کرکے جاحظ سے ملنے کے لیے بصرہ پہنچے تو لوگوں سے پوچھتے ہوئے ان کے مکان تک پہنچے۔ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک سن رسیدہ بزرگ سامنے بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے گرد تقریباً بیس نوجوان طلبہ کا حلقہ ہے۔ الاندلسی نے سلام کے بعد پوچھا کہ آپ میں سے ابوعثمان (جاحظ کی کنیت) کون ہیں؟ جاحظ نے کہا جی ہاں، فرمایئے! آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا اندلس سے۔ جاحظ نے کہا اندلس سے؟ وہ تو احمقوں کی سرزمین ہے۔ پھر جب نام پوچھا تو انھوں نے کہا سلام۔ اس پر جاحظ نے کہا، اس کی بھی ایک رہی، یہ تو ایک کتے کا نام ہے، اور آپ کے والد ماجد کا نام؟ اندلسی نے کہا ابوخلف۔ ارشاد ہوا، واہ وا کیا نام ہے! یہ تو دراصل زبیدہ کے بندر کی کنیت ہے، اور ہاں یہ تو بتایئے کیسے آنا ہوا؟ پریشان حال اندلسی نے کہا علم سیکھنے کے لیے۔ اس پر جاحظ نے ناک بھوں چڑھائی اور کہا آپ علم نہیں سیکھ سکتے، الٹے پاؤں واپس تشریف لے جایئے۔ ذرا اندازہ کیجیے اس طالب علم کی سراسیمگی کا جس نے محض جاحظ سے علم سیکھنے کے لیے یہ طویل سفر اختیار کیا تھا، اور جب منزل پر پہنچا تو یہ تحقیر آمیز جواب ملا۔ اس نے بڑی منت وسماجت کی، اس کے بعد علامہ روزگار ذرا مسکرائے، پھر کہنے لگے، مرد خدا! علم کی خاطر آئے ہو اور ہمارے مکان میں داخل ہونے کے بعد یہ بھی نہیں دیکھا کہ اس جماعت میں ہمارے سوا اور کسی کی داڑھی نہیں ہے۔ کم سے کم اتنا تو سمجھا ہوتا کہ داڑھیل صرف جاحظ ہی ہوسکتا ہے۔ اس کے بعد اندلسی کی "خطاؤں" سے درگذر ے اور اپنے حلقہ میں شامل کرلیا۔ ابھی چند دنوں کا ذکر ہے کہ برسلز یونیورسٹی[۲۲] کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شہرہ آفاق استاد آبل (Abel) صاحب نے ہمارے غریب خانہ کو نوازا۔ یہ شعبہ عربی کے استاد ہیں اور مجھ پر اکثر کرم فرمایا کرتے ہیں۔ باتوں ہی باتوں میں جب جاحظ کا ذکر آیا تو کہنے لگے، یہ حیرت انگیز دماغ کا مالک قبل از وقت پیدا ہو گیا، اسے تو فرانسیسی روسو[۲۴] کا ہمعصر ہونا چاہیے تھا۔ وہی روسو کے سے تیور ہیں۔ وہی تعمق اور وہی انسانی محبت۔ پھر چاء کی پیالی ہاتھ میں لیتے ہوئے بولے، یہ شخص صحیح معنوں میں ایک متحرک کتب خانہ تھا جہاں ہزاروں علوم کی کتابیں جمع رہتی ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ بعد کے مصنفین نے جن رسالوں کو جاحظ کے نام سے منسوب کر دیا تھا، ان پر تنقیدی نظر ڈالی جائے۔ اگر ان یکتائے روزگار اہل علم کے زمانے میں ٹائپ رائٹر ہوتا اور مختصر نویس، تو یقین مانو ان میں سے ہر عالم ایک لائبریری چھوڑ جاتا۔ اللہ اللہ، وہ بھی کیا انسان تھے جنھوں نے محض علم کی ترقی کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا اور [ایسے ایسے موضوعات پر کتابیں لکھ ڈالیں جن کی بازار میں مانگ نہیں تھی۔ زمانے کی رو میں ہر مصنف بہہ جایا کرتا ہے مگر حیات جاوید ان ہی کو حاصل ہوتی ہے جو وسعت نظر کے ساتھ اپنے سینہ میں کشادگی بھی رکھتے ہیں۔

کچھ خطوں کے بارے میں کہہ رہا تھا اور بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ آپ اس عربیت سے تنگ آ گئے ہوں گے۔ اس لیے گفتگو کا موضوع بدلنا چاہیے۔ ابھی لکھتے لکھتے یہ خیال آیا کہ اس برفباری کے موسم میں آپ کو بلجیم کھینچ لاؤں۔ ایک بات اور سن لیجیے کہ ہمارے شعراء جب موسم سرما کا نقشہ کھینچتے ہیں تو ان کو دھوپ نظر آتی ہے، سودا کہتے ہیں:

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید
صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

اور یہاں جب زمستانی شدت دکھانی مقصود ہوتی ہے تو عام طور پر لوگ کہتے ہیں کہ مارے سردی کے الو بھی اکڑا ہوا تھا۔ الو کی اہمیت آپ کے یہاں ہو یا نہ ہو، یہاں اسے مبارک پرندہ سمجھتے ہیں۔ سعدی کا ایک مشہور شعر ہے:

بلبلا مژدۂ بہار بیار   خبر بد بہ بوم شوم گذار

اگر اس کا فرانسیسی ترجمہ کر ڈالوں تو لوگوں کی سمجھ سے بالاتر یہ شعر ہے کیونکہ الو تو نیک فال ہے۔ اس کی دونوں آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی ہے اور یہ آنکھیں وقت کے سینہ کو چاک کرتی ہوئی دھندلے مستقبل تک پہنچ جاتی ہیں۔ ایک رئیس مجھے اپنی عمارت دکھا رہے تھے، جب وہ آراستہ خواب گاہ میں لے گئے تو دیکھا کہ مسہری کے قریب میز پر ایک خوبصورت الو چوبی لباس میں بیٹھا ہوا ہے اور اس کی دو بڑی بڑی آنکھیں برقی قمقموں سے بنی ہیں۔ ذرا اندازہ کیجیے اس فرنگستانی کی قسمت کا جسے صبح و شام الو کی زیارت نصیب ہوتی ہے،

اے وائے بہارے اگر این است بہارے

سگار اب ختم ہوا چاہتا ہے اس لیے آپ سے رخصت ہونا چاہتا ہوں۔ اے کاش، فرصت کے لمحات میسر ہوتے، کوئی سنجیدہ سا مضمون معارف کے لیے لکھ ڈالتا، مگر ''افکار معیشت کے فرصت ہی نہیں دیتے'' اور ہاتھ مل کر رہ جاتا ہوں کہ اس قلم سے خرافات کی بجائے حیات افروز سطریں نہ لکھ سکا۔

جی کس قدر افسردگی دل پہ جلا ہے

آپ کو دیکھے ہوئے زمانہ گذر چکا ہے۔ پتہ نہیں کب ملاقات ہوگی۔ یہی کیا کم ہے کہ خطوں کے بہانے نصف ملاقات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو ہو جایا کرتی ہے۔

محبت کیش

اختر امام

(۳)

مکتوب ماسکو

یہ مکتوب میرے عزیز دوست ڈاکٹر سید اختر امام ام۔اے علیگ (پی ایچ ڈی، برلن) کا ہے۔ اس وقت وہ لنکا یونیورسٹی میں شعبہ عربی اور اسلامیات کے صدر ہیں۔ لنکا کی طرف سے بین الاقوامی امن کانفرنس میں گئے ہوئے تھے، جو اکتوبر ۱۹۷۳ء میں ماسکو میں منعقد ہوئی تھی، وہیں جناب شوکت سلطان صاحب پرنسپل شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج سے ملاقات ہوئی، جو ہندوستان کی طرف سے اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ ''ص ع''

ماسکو

۱رنومبر ۷۳ء

عزیز دوست صباح الدین صاحب، سلام و محبت

اردو میں خط لکھتے وقت ایک مشہور شعر یاد آرہا ہے جو غالباً آرزو لکھنوی کا ہے،

کس نے پٹکا کھینچ کے ساغر موسم کی بے کیفی پر
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی

آپ ٹھہرے ادیب اور مصنف، ایک دو نہیں بلکہ بیسیوں کتابوں کے، اس لیے دل ہی دل میں مسکرائیں گے کہ آرزو نے تو یہ شعر جھنجلا کر کہا ہوگا کہ جب آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی نہ ہوں تو پینے والے آخر پئیں تو کس منہ سے؟ پینے کا لطف تو جب ہی ہے کہ گھنگھور گھٹائیں موسلا دھار مینھ برسائیں۔ فطرت کی ستم ظریفیوں پر جب شاعر نے اپنے پیالہ کو دے پٹکا، تو معاف کریں، اندر دیوتا بھی مسکرا دیئے چونکہ میگھ یا برشگال انہی کے قبضہ تصرف میں ہے، تو انھوں نے دیکھتے ہی دیکھتے جل تھل کر دیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے میرے دیرینہ دوست! ماسکو کے پس منظر میں تو یہ شعر نامناسب ہی ہے، اور اختر امام بس الّلٰی ٹپ ہی چلائے جاتا ہے۔ اس لیے عرض یہ ہے کہ اس ماحول یا پس منظر میں اس سے زیادہ موزوں یا چست شعر مجھے ملا ہی نہیں؟ وہ کیسے؟

جب میں یہاں لنکا کے وفد کے ساتھ ہوائی جہاز سے اترا تو برفباری برائے نام ہو رہی تھی۔ میں نے رفقا سے کہا، یہ تو ماسکو کی توہین ہے کہ ہلکی ہلکی پھواروں کی طرح برفباری ہو، جی تو چاہتا ہے کہ شدت کی برفباری دیکھوں۔ دوسرے اور تیسرے دن کچھ زیادہ برفباری ہوا کی، تاہم وہ لطف نہ آیا جس کے لیے میں چشم براہ نہیں بلکہ منتظر تھا۔ ایک ہفتہ بعد آج باضابطہ برفباری شروع ہوئی اور اس طرح کہ خزاں رسیدہ درختوں کی ننگی ٹہنیاں سفید برف کی تہوں سے مالا مال ہو گئیں۔ کانگریس والے مہمانی تشریفات یعنی اخلاقی ضوابط کے تحت لینن[۲۴] کی آرامگاہ کی طرف چل پڑے جو اس عظیم الشان ہوٹل سے چوتھائی میل پر واقع

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔سفید میدانوں میں کالی کالی چیونٹیوں کی قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ یہ سیاہ لمبے لمبے لبادوں اور کنٹوپ میں ملبوس غیر ملکی مہمان تھے۔ جس طرح شمالی ہندوستان میں کار گذرنے کے بعد دھول اڑتی رہتی ہے، یا گردوغبار اڑانے والی ہوائیں چلتی رہتی ہیں، اسی طرح برف کی پھواریں آڑی ترچھی لہراتی ہوئی گذر رہی تھیں، جن سے کالے لبادے اور کنٹوپ بھی سفید ہوتے جا رہے تھے۔میں اس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وقت کی سوئیوں کو لاکھوں بار گردش دے کر میں طالب علمی کے اس ولولہ انگیز اور رومان پرور دور میں پہنچ گیا جب کہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ سیر سپاٹے کیا کرتا تھا اور سب لوگوں کے چہرے برف آلود ہو جایا کرتے تھے۔آپ دیکھتے ہیں کہ بات شروع ہوئی تھی آرزو لکھنوی کے ایک زوردار شعر سے اور بہکتا ہوا، بلکہ برف پر پھسلتا ہوا کہاں سے کہاں جا پہنچا!

آپ کے لیے یہ عریضہ معمّہ ہی ہوگا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ کہاں تو میں آپ کو لچھے دار خطوط لکھا کرتا تھا، اور پھر شامت اعمال سے یہ سلسلہ بند ہو گیا، کیوں؟ یہ میں خود بھی نہیں جانتا ہوں۔ پھر ذرا یہ وحشت ملاحظہ ہو کہ یاد آئے کہاں؟ ماسکو میں! آپ کی یاد تو بخدا ہمیشہ شگفتہ رہا کی، مگر اس کی توفیق نصیب نہیں ہوئی کہ ایک مخلص دوست کو چند سطریں ہی لکھ ڈالوں۔ایران کے ڈھائی ہزار سالہ جشن ملوکیت میں شاہی دربار نے مجھے نوازا تھا۔شیراز میں لنکا اور ایران کے ثقافتی تعلقات پر ایک مقالہ بھی پڑھا تھا، جسے جانے کیوں، بہت سراہا گیا، اور اب منجملہ اور بلند پایہ مقالوں کے جو مستشرقین نے پیش کیے تھے، آپ کا یہ دیرینہ دوست بھی ایک تاریخی جلد میں خرافات بک رہا ہے۔سونچا [سوچا] تھا کہ جزیرہ کو لوٹنے کے بعد آپ کو اپنے تاثرات لکھوں گا، مگر بات تھی آئی گئی ہو گئی، یا غالب کی زبان میں یوں کہہ لیجیے کہ:

تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

شاید یہ خط بھی معرض التوا میں پڑ گیا ہوتا مگر چونکہ آج مجلسوں اور دعوتوں کی رسمی دنیا سے بے نیاز ہوں اس لیے آپ کا یہ نیاز مند حاضر خدمت ہے۔آپ کو کہاں نہیں یاد کیا۔عشرتناک راتوں میں اور روحانی مجلسوں میں آپ رفیق رہا کیے، برطانی میوزیم کے کرم خوردہ نسخوں کی اوراق گردانی کرتے ہوئے آپ رہ رہ کر نمودار ہوا کیے، ''رقص شرز'' اور رت جگے میں بھی دل نے کہا تھا کہ ہائے نہ ہوا ہمارا مصنّف، ورنہ اس وقت وہ اقبال کے ایک مصرعے کی داد دیتا:

گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی

اب ہماری خوش نصیبی دیکھیے کہ اس بین الاقوامی اجلاس میں ایک آپ کے ہم وطن تو نہیں، ہم شہر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ان کے ہاتھ میں علامہ شبلی نعمانی[۲۵] پر نظر پڑی؛ شبلی کے بعد جب سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن پر نظر گئی تو میں نے وہ کتاب چھین لی، اور ہمارے کرم فرما نے بخوشی ہماری دست درازی تسلیم کر لی۔ یہ تھے آپ کے شوکت سلطان صاحب![۲۶] ماسکو میں صباح الدین کی یہ تصنیف اور وہ بھی اردو میں! کیا کہنے اس حسن تضاد کے!

عید کی نماز یہاں کی مسجد میں پڑھی۔ڈیڑھ دو سو بیرونی نمازیوں سے قطع نظر خود مقامی مسلمانوں کی تعداد بلا مبالغہ چار پانچ ہزار سے کم نہ ہوگی۔ مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی اور باہر برفیلی سطح پر جانمازیں بچھی ہوئی تھیں۔سنا کرتا تھا کہ ماسکو میں جو مسجد ہے اس میں صرف معمّر اور پیر فرتوت قسم کے نمازی دیکھے جاتے ہیں۔ میں نے تو جماعت میں ہزاروں نوجوان اور بچے بھی دیکھے۔ اب اپنی آنکھوں پر ایمان لاؤں یا خبر تراشوں پر؟ امام صاحب سے نماز بعد میں خود ملا اور عربی میں باتیں کیں۔شوکت سلطان صاحب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ کو مفصل حالات سنائیں گے۔

۶۰ء میں پاکستانی اعلیٰ ملازمت کو خیر باد کہہ کر لنکا آ گیا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک عربی اور اسلامیات کے شعبہ کا نگراں ہوں۔

یہاں سے واپسی میں کراچی اتر پڑوں گا۔ سونچا [سوچا] کہ تعطیل کا زمانہ ہے، لگے ہاتھوں عزیزوں سے ملتا ملاتا ہوا براہِ لاہور، اسلام آباد چلا جاؤں جہاں منجملہ اور احباب کے ڈاکٹر محمد شمیم سے بھی ملاقات ہوگی جو ڈھاکہ سے سب کچھ کھو کر اور جان بچا کر وہاں آ گئے ہیں اور طبابت کرتے ہیں۔

چونکہ پاکستان میں شاید مہینہ بھر تک آوارہ گردی کرتا پھروں، اس لیے مناسب یہی سمجھا کہ سرزمین روس ہی سے لکھوں کیونکہ ہندو پاکستان کے درمیان حقہ پانی بند ہے۔

اب اجازت ہو۔

آپ کا دیرینہ دوست

اختر امام

(۴)

مکتوب سری لنکا

از پروفیسر ڈاکٹر اختر امام صدر شعبہ اسلامیات و عربی، سری لنکا یونیورسٹی

۳۷۶، ٹرین کومالی سٹریٹ، کینڈی، سری لنکا

پیارے دیرینہ دوست سید صباح الدین صاحب سلام ومحبت

کل صبح ایک طویل سفر کے بعد ''وطن'' لوٹا ہوں۔ خطوط کے ہجوم میں دیکھا کہ ہمارا دیرینہ دوست اور بیسیوں سنجیدہ کتابوں کا مصنف بھی مسکرا رہا ہے۔ دل میں کہا کہ دوستی کی شریعت میں گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوں گا اگر سب سے پہلے اس مخلص سے ہاتھ نہ ملاؤں۔ اس لیے اولین فرصت میں نیم ملاقات کے بعد آپ کو یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔

سولہ دن شیوعیت[۲۷] کے ہردوار میں گذارنے کے بعد واپسی پر میں کراچی اتر پڑا تھا تا کہ عزیز و اقارب سے مل سکوں، اردو میں باتیں کروں، مشاعروں میں شرکت کروں اور گلابی جاڑے میں شمامۃ العنبر یا موتیا سے دل و دماغ کو معطر کروں۔ کراچی کے بعد لاہور گیا جہاں منجملہ اور حضرات کے پروفیسر ارشد بھٹی سے بھی ملنا تھا، جنھوں نے اسلامی زاویۂ نظر سے کوئی آدھ درجن درسی کتابیں اردو میں لکھ ڈالی ہیں۔ ان کتابوں سے قطع نظر انھوں نے اسلامیات پر بھی اپنی سنجیدہ تصنیفیں پیش کی ہیں۔ لاہور میں کڑاکے کی سردی تھی، تاہم اہل علم کی صحبتوں سے دل کو گرماتا رہا۔ وہاں سے اسلام آباد گیا، جہاں بچپن کے ہم سبق شمیم دیسنوی کو بھی ڈھونڈھ نکالا۔ شمیم ڈھاکہ میں طبابت کرتے تھے اور گرداب بلا سے صحیح وسلامت بچ کر نکل گئے تھے۔ جب چوتھائی صدی نہیں بلکہ نصف صدی کے بعد ان سے ملا تو سر کے بال بالکل سفید نظر آئے۔ ویسے تندرست ہیں مگر ضعیفی کے آثار، خدوخال سے نمایاں تھے۔ اسلام آباد سے کراچی پہنچا اور ۱۰؍دسمبر کو جب لنکا کے مطار میں قدم رکھا تو ساون بھادوں کی جھڑیاں لگی ہوئی تھیں، ناریل کے خوشنما پتے ہواؤں میں جھول رہے تھے، اور زعفرانی چادروں میں لپٹے لپٹائے ہوئے بھکشو آ جا رہے تھے۔ ابھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مشکل سے گھر پر ایک ہی ہفتہ گذرا تھا کہ سرکاری حکمنامہ ملا کہ کمر بستہ ہو کر کل جو تجارتی وفد جزیرۃ العرب اور شمالی افریقہ جا رہا ہے، اس میں شامل ہو جاؤں۔ دیارِ عرب اور مصر کے چپہ چپہ سے واقف پہلے بھی تھا مگر اس سفر میں دلکش عنصر یہ بھی پیش نظر تھا کہ معمر قذافی[28] کے لیبیا میں سانس لینے کا موقع ملے گا۔

کولمبو سے کراچی ہوتا ہوا کویت پہنچا۔ یہ ہمارے طویل سفر کی پہلی منزل تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا، ہم لوگ مطار سے تقریباً بارہ میل سفر کرنے کے بعد شہر میں داخل ہوئے۔ کویت کے متعلق ہمارا خیال یہ تھا کہ تیل کی بے شمار دولت سے ہوگا یہ بھی امیر شہر مگر عام مشرقی شہروں کی طرح جہاں چند سڑکیں تو خوشنما مکانوں اور دکانوں سے دلکش ہوا کرتی ہیں مگر شہر کا بقیہ حصہ عموماً گندا ہی ہوا کرتا ہے، اور خاک اڑتی رہتی ہے۔ مگر کویت میں داخل ہونے کے بعد کچھ یوں محسوس کیا جیسے میں ہیمبرگ یا میونخ کے کسی حصہ میں سانس لے رہا ہوں۔ وہی مغربی طرز کے فٹ پاتھ اور سڑک کے وسط میں دور تک درختوں کی قطاریں تا کہ آمد و رفت کے لیے علاحدہ سڑک ہو۔ آراستہ مکانوں اور جگمگاتے ہوٹلوں کو دیکھتا چلا گیا۔ رات کے وقت سیر سپاٹے کے لیے نکلا اور قلب شہر سے ہٹ کر رہائشی علاقوں اور گلیوں کا رخ کیا اور ہر دو قدم کے بعد مجھے مغربی یورپ کے شہروں کے مضافات ہی نظر پڑے۔ دل میں کہا کہ دیارِ عرب اور یہ صفائی! علمی اعتبار سے بھی کویت عربی دانش کدوں کا سرتاج ہے۔ ایک دل خوش کن حقیقت یہ بھی ہے کہ روئے زمین پر انفرادی ماہانہ آمدنی کویت کے برابر نہیں ہے۔

کویت سے بغداد پہنچا جہاں پہلے بھی پاکستانی ملازمت کے زمانے میں رہ چکا تھا۔ سڑکوں کے کنارے کتب فروش، کتابوں کو پھیلائے بیٹھے تھے۔ جہاں ادب اور مذہب کے علاوہ لینن اور کارل مارکس[29] کے شیوعی تصورِ حیات پر بھی کتابیں موجود تھیں۔ اخباروں میں پہلے وزیروں کے ناموں کے ساتھ ''معالی الوزیر'' یعنی ہز ایکسیلنسی لکھنے کی رسم تھی، اب اس کی جگہ ''رفیق'' نے لے لی ہے جو کامریڈ کا ترجمہ ہے۔ سرکاری عمارتوں پر جلی حرفوں میں ہر جگہ جو چیز جاذبِ توجہ تھی وہ یہ ہے کہ اُمّۃ ''عَرَبِیّۃ'' ''اُمّۃ'' وَاحِدۃ، ذَاتُ رِسَالَۃِ خَالِدَۃِ۔[30] بعض گلیوں میں بھی نَحْنُ اُمّۃُ اِشْتِرَاکِیّۃُ[31] بھی زینتِ دیوار تھا۔ سرکاری عہدہ داروں سے بھی تبادلہ خیال کا موقع ملا اور سبھوں کو یہی کہتے سنا کہ عربی اشتراکیت میں اقتصادی فلاح و بہبودی کا راز مضمر ہے۔ نَحْنُ عَرَب ''قَبْلَ کُلِّ شَیْئٍ''[32] سے بھی گوش آشنا ہوا۔ وفد کے کاموں اور ترجمانی سے فراغت ہوئی تو سیدنا حضرت محی الدین الجیلانیؒ[33] کے آستانے پر بھی سلام کے لیے حاضر ہوا۔ یہ بھی عجیب روحانی دربار ہے، قلب کو فرحت نصیب کیسے نہ ہوتی؟ جمعہ کی نماز امام ابوحنیفہ[34] کی مسجد میں ادا کی جو اب بھی امام اعظم کے نام سے پکارے جاتے ہیں اور پورا محلہ الاعظمیہ کہلاتا ہے۔ مسجد کے برابر جو قدیم گورستان ہے اس کا بیشتر حصہ کھود کر برابر کر دیا گیا ہے۔

۱۹۵۱ء میں ہمارا یہ دستور رہا کرتا تھا کہ امام اعظم کی مسجد سے نکل کر اس تاریخی گورستان کا رخ کیا کرتا تھا، تا کہ منصور حلاج[35] کے ہم عصر مشہور صوفی حضرت ابوبکر شبلیؒ[36] کو فاتحہ پیش کر سکوں۔ ایک قابلِ غور بات یہ بھی ہے کہ اہلِ بغداد کس کس قبر کو محفوظ رکھیں، اس خاک میں تو سیکڑوں درخشندہ ستارے دبے ہوئے ہیں۔ امتدادِ زمانہ سے جہاں اور قبریں مٹ چکی ہیں ان میں امام احمد بن حنبلؒ[37] کی ضریح مبارک کا نام و نشان بھی مٹ چکا ہے، وہی امام حنبل جنھوں نے متضاد سیرت کے حامل المامون[38] کے ہاتھوں قید خانے کی سختیاں برداشت کیں، اور مسند[39] کی عظیم جلدیں لکھ ڈالی تھیں اور بقول ابن خلکان[40] جب جنازہ اٹھا تو لاکھوں مردوں کے علاوہ کم از کم ساٹھ ہزار عورتیں بھی جنازہ میں شریک تھیں۔ قبروں کا نشان باقی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہے یا نہ رہے یہ بھی ان نفوس قدسیہ کی طرف سے اعلان ہوتا رہا ہے کہ

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجو
در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست[41]

بغداد سے قاہرہ گیا اور پھر وہاں سے آسوان تاکہ سدّ العالی[42] بھی دیکھ لوں پھر ہمارا وفد سرکاری عنایتوں سے لکسر (Luxor) گیا۔ فراعنہ مصر کے عالی شان محلوں کے کھنڈرات دیکھ کر ان کی عظمت بیدار ہو جاتی ہے، ان محلوں کو مصری اقصر کہتے چلے آئے ہیں، اور یہی الاقصر اب فرنگی لہجہ سے لکسر[43] کے نام سے مشہور ہے۔

عید کی نماز میں نے ماسکو میں پڑھی تھی اور عید الاضحیٰ کی الاقصر میں۔ نیل کے کنارے اس روز رنگ برنگ ملبوسات کی بہار تھی۔ رنگا رنگ بادبان تیز ہواؤں میں آنچلوں کی طرح لہرا رہے تھے۔

مشہور یہودی کروڑ پتی راک فیلر[44] نے بیش بہا رقم مصری اثری اکتشافات کے لیے دی تھی۔ جب آثار فراعنہ منظر عام پر آئے تو دنیا ان کی مردہ ثقافت کو دیکھ کر انگشت بدنداں ہو گئی تھی۔ پھر مصریوں کو ماقبل اسلام تہذیب فراعنہ کا احساس ہوا اور رفتہ رفتہ وہ اس کے گرویدہ ہو گئے۔ قاہرہ ریلوے اسٹیشن کے باہر مشہور فرعون راسمیس[45] کا بت نصب کیا گیا، ڈاکخانہ کے ٹکٹوں اور نوٹوں پر فراعنہ کی صورتیں ظاہر ہوئیں اور یہ فرعونیت اب بھی عروج پر ہے۔ ان اکتشافات سے فرنگستان اور امریکہ کا جو مقصد تھا وہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا یعنی یہ کہ مصری اسلامی تہذیب نہیں، بلکہ فرعونی تہذیب کے گرویدہ ہو جائیں۔ آپ نے دیکھا کہ

کجا می نماید کجا می زند

مغربی مؤرخین اپنی تہذیبی میراث کا ذکر خیر یونان سے شروع کرتے ہیں، پھر رومۃ الکبریٰ کے شاندار کارناموں کے سراہنے کے بعد صدیوں کو پھاندتے ہوئے یورپ کی نشاۃِ ثانیہ پر آ کر دم لیتے ہیں جیسے غرناطہ اور قرطبہ [نا] قابل توجہ ہیں۔

جب میں طرابلس[46] پہنچا تو فجر کا تارا جھلملا رہا تھا۔ ہوٹل پہنچتے پہنچتے اجالا ہونے لگا تھا۔ ہم لوگ اپنے اپنے کمروں میں جا کر بستروں پر دراز ہو گئے۔ رت جگا کے خمار کو دور کرنا ہی تھا۔ ناشتہ کے بعد جب باہر نکلا تو پہلی چیز جو نظر آئی وہ یہ کہ دکانوں کے تختوں پر کہیں بھی لاطینی رسم الخط میں کوئی تحریر نہ تھی۔ بس عربی ہی عربی۔ طرابلس ایک دلکش اور آراستہ شہر ہے۔ مغربی طرز کا جنوبی فرانس یا بلجیم کے پایہ تخت برسلز سے ملتا جلتا۔ جب وزیر تخطیط یعنی (Minister of Planning) سے [مل] ملا کر تبادلہ خیال کے بعد بحیرہ روم کے کنارے کنارے ہوتے ہوئے وزیر النفط یعنی وزیر روغن کے یہاں جا رہے تھے، تو چوراہوں پر موٹے حرفوں میں جو ارشادات نظر آئے انھیں آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ۔ (قرآن کریم)[47]

آگے چل کر دوسری شاہراہ پر جس آیت کریمہ پر نظر پڑی وہ یہ تھی:

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَیَرَی اللّٰہُ عَمَلَکُمْ وَرَسُوْلُہٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ۔ (قرآن کریم)[48]

قلب شہر میں معمر قذافی کی تقریر کا جو حصہ قابل توجہ تھا وہ یہ کہ:

اَلثَّوْرَۃُ الثَّقَافِیَّۃُ لَا تَنْبَعُ مِنْ فَرَاغٍ اِنَّمَا تَنْطَلِقُ مُسَلَّحَۃً بِالنَّظَرِیَّۃِ الثَّالِثَۃِ وَھِیَ لَیْسَتْ مِنْ صُنْعِ الْاِنْسَانِ اِنَّمَا ھِیَ عَوْدَۃٌ لِتَطْبِیْقِ الْاِسْلَامِ[49]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسری جگہ ایک سرکاری عمارت پر یہ آیہ شریفہ لکھی تھی:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ (قرآن کریم) [۵۰]

ایک ریستوران کے اندر موٹے حرفوں میں لکھا تھا:

اَلنَّظَافَةُ مِنَ الْاِيْمَانِ [۵۱]

یہی نہیں بلکہ تبلیغ کا دائرہ شاہراہوں سے ہوتا ہوا ایک دینار کے نوٹ تک آ گیا تھا۔ نوٹ پر لکھا ہوا تھا: وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ [۵۲] اور اس کے نیچے صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْم۔ [۵۳] یہاں نہ فرعون کی تصویریں اور نہ ماقبل اسلام کی روایات سے تہذیبی سلسلہ جوڑا گیا تھا۔

جب میں قرآن و حدیث کے ارشادات کو دیکھ رہا تھا تو مشہور تاریخ الفخری کا مصنف ابن طقطقی [۵۴] یاد آیا جس نے بنو اُمیہ کے رجحانات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سلیمان [۵۵] مشہور خوش خوراک تھا۔ اسے لذیذ کھانوں کا بے حد شوق تھا۔ اس کے عہد میں عوام جب دمشق کے با[زا]روں میں ملتے تھے تو ایک دوسرے سے پوچھا کرتے تھے، رات تم نے کیا پکایا تھا۔ یزید بن معاویہ [۵۶] کے دورِ حکومت میں ناچ گانے کا زور تھا اور شراب کھلم کھلا پی جاتی تھی، چونکہ بادشاہ شراب کا رسیا تھا، اور گوری گوری دوشیزاؤں کے جھرمٹ میں سانس لیتا تھا۔ یہ مؤرخ حضرت عمر بن عبدالعزیز [۵۷] کے عہد کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ لوگ بازاروں میں جب ملتے تو آپس میں پوچھتے کہ رات تم نے تہجد کی نماز پڑھی یا نہیں؟ صباح الدین صاحب، یہ ہے عکس اَلنَّاسُ عَلٰى دِيْنِ مُلُوْكِهِمْ کا۔ طرابلس میں اسلامی شریعت کی فضا کیسے نہ ہو جب کہ جواں سال معمر قذافی شریعت کا پابند ہے؟

پہلے جہاں شراب خانے تھے وہ اب مختلف قسم کے شربتوں سے آباد ہیں۔ آپ کو ہوٹلوں میں نارنگی، انار، انگور اور سیب کے رس ملیں گے۔ شراب کا کہیں نام ہی نہیں ہے۔ قمار خانے اور مراقص (ناچ گھر) ویران پڑے ہیں۔ ملک میں چوری کی وارداتیں گویا ناپید ہو چکی ہیں، طوائفوں کی جماعت کا خاتمہ ہو چکا ہے، دکانوں میں ایمانداری کا یہ عالم ہے کہ نہ چور بازاری ہے اور نہ دغابازی۔ اگر کوئی شراب پیتا ہوا پایا گیا یا کسی بیرونی ملک سے بوتل لے آیا تو شریعت کے مطابق سزائیں دی جاتی ہیں۔

ایک دن میں نے اپنے ہوٹل میں چند خوش پوشاک افریقیوں کو دیکھا جو مشک فام تھے۔ میں نے سلام کے بعد ان سے پوچھا کہ آپ کس ملک سے آئے ہیں؟ میں نے سوال انگریزی میں کیا تھا، اس نے فرانسیسی میں کہا وہ مغربی افریقہ کے جمہوریہ گابون (Gabon) سے آیا ہے، کیونکہ وہاں کے صدر جمہوریہ عمر گابون [۵۸] کل تشریف لائیں گے۔ یہ پہلے رومن کیتھولک تھے اور گذشتہ سال مشرف باسلام ہوئے۔ صدر گابون کی شریف [تشریف] آوری کے بعد اسی ہوٹل میں صدر لیبیا معمر قذافی نے ایک دعوت کی جس میں ہمارا وفد بھی شریک ہوا اور میں اس جلیل القدر رئیس ملت سے مل سکا۔ دعوت میں ڈنر کے موقع پر نارنگی اور سیب کا رس گلاسوں [میں] بھرا ہوا تھا۔ دوسرے دن شام کو طرابلس کے روزنامہ الفجر الجدید میں پڑھا کہ کل شام بارہ گابونی عمائدین جمہوریہ نے اپنی [اپنی] شریک حیات کے ساتھ قذافی کے ہاتھ پر کلمہ شہادت پڑھا اور اسلامی برادری میں شریک ہوئے۔ وہ اخبار اس وقت ہمارے سامنے ہے اور سبھوں کے اسلامی نام افریقی ناموں کے ساتھ درج ہیں۔

طرابلس کے ساتھ اسلامی تاریخ کے زریں ایام وابستہ ہیں۔ اسی طرابلس کی خاک سے فاطمہ بنت عبداللہ [۵۹] طلوع ہوئیں جن کی جرأت اور شہادت پر ابوالکلام نے ایک خون کو گرما دینے والا مقالہ [۶۰] لکھ ڈالا اور اقبال کی وہ معرکۃ الآرا نظم "فاطمہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنت عبداللہ''[۶۱] آپ کے سامنے ہے۔اسی طرابلس کے جیالے استعمار فرنگ کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے اور برتر عسکری قوت سے جام شہادت پیتے رہے جس کی صدائے بازگشت اقبال کی اس نظم میں ہے جس میں شاعرِ مشرق کہتے ہیں:

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں[۶۲]

ہاں، ایک اور خصوصیت لیبیا کی یہ ہے کہ نہ صاحب المعالی اور کامریڈ سے وزراء کو یاد کیا جاتا ہے اور نہ صاحب السعادۃ سے، بلکہ محض ''الاخ''، یعنی بھائی سے۔ دیکھا آپ نے بغداد اور طرابلس کا فرق؟

واپسی میں شاہ فیصل[۶۳] سے ملنے کے لیے ہم لوگ جدہ گئے، جہاں شاہی محل میں باریابی ہوئی۔ میں وفد سے رخصت ہو کر مکہ مکرمہ گیا تا کہ عمرہ کی سعادت نصیب ہو۔

ہاں آپ نے ہمارے لندن کے قیام کے بارے میں پوچھا ہے۔ میں ایک سال سے اوپر یونیورسٹی کی اجازت سے برطانوی میوزیم میں عرب اور سیلون سے متعلق مواد جمع کرتا رہا۔ اب ان مصادر کے سہارے اپنی کتاب کو ترتیب دے رہا ہوں۔ ۷۱ء کے اکتوبر میں شاہ ایران کی دعوت پر ڈھائی ہزار سالہ جشن ملوکیت میں شرکت کے لیے گیا تھا۔ جہاں شیراز میں کنگرۂ ایران شناسان(World Congress of Iranologists) میں Ceylon-Iran Cultural Relations پر ایک مقالہ بھی پڑھا تھا جو اور علماء کے مقالوں کے ساتھ کتابی صورت میں تہران سے شائع ہوا ہے۔

ہماری اہلیہ ٹھیٹھ سیلونی ہیں۔ یہ لوگ Moor کہلاتے ہیں۔ میں نے انھیں اردو سکھادی ہے۔ ان سے صرف اردو میں باتیں کرتا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ دوران سفر میں بہاریوں کی توجہ سے انھوں نے آلو کی بھجیا، ورقی روٹی، طہری، کھچڑی اور پلاؤ پکانا [بھی] سیکھ لیا ہے۔

شمالی ہندوستان سے یادیں وابستہ ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ اچانک اعظم گڑھ آ دھمکوں اور آپ کی زیارت نصیب ہو۔

لنکا کے شہر کینڈی میں جو کولمبو سے بہتر میل وسط جزیرہ میں ہے، رہتا ہوں۔ ۶۰ء میں جب کہ میں انڈونیشیا میں تھا، استعفا دے کر چلا آیا تھا اور ۱۹۶۴ء میں باضابطہ طور پر یہاں کا شہری بن گیا۔ اب سیلونی پاسپورٹ پر دیس بدیس مارا مارا پھرتا ہوں۔

یہ جزیرہ بے حد دلکش ہے، شادابیاں تو بس پھٹی پڑتی ہیں۔ خوشبودار مسالوں اور رنگارنگ وادیوں میں ہمارے لیل و نہار گذر رہے ہیں۔

جزیرہ میں اکثریت سنہالیوں کی ہے جو بدھ مت کے پیرو ہیں۔ یہ لوگ گائے کا گوشت بھی کھاتے ہیں اور سؤر کا بھی۔ ان میں مذہبی تعصب نہیں ہے، مسلمانوں سے خوش گوار تعلقات ہیں۔

مؤرخ البلاذری[۶۴] نے فتوح البلدان[۶۵] میں لکھا ہے کہ سیلون کو ہم لوگ جزیرۃ الیاقوت بھی کہتے ہیں کیونکہ یہاں کی دوشیزائیں بے حد خوبصورت ہیں۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: **اِنَّمَا سُمِّیَتْ هٰذِهِ الْجَزِیْرَة جَزِیْرَةُ الیَاقُوْتِ لِحُسْنِ وُجُوْهِ نِسَائِهَا۔**[۶۶]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہمارے لنکائی صاحبزادے [۶۷] اب ماشاءاللہ وکیل ہو گئے ہیں۔

طرابلس سے جو کارڈ یہاں آیا تھا وہ اس وقت حاضر خدمت ہے۔

آپ کا دیرینہ دوست

اختر

(۵)

تعزیتی خط

۱۰ر دسمبر ۸۷ء

ابھی مؤتمر کراچی کے ہفت روزہ مسلم ورلڈ سے اطلاع ملی کہ ہمارے عزیز دوست اور بلند پایہ مصنف صباح الدین صاحب ہم لوگوں سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن [۶۸]

صباح الدین کو مرحوم لکھتے ہوئے قلم اشک ریز ہے، مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ کی رو سے یہ کہنا صحیح ہے کہ: ع

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس خاکدان میں عمر طبعی بھی کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے، مگر اس حقیقت کے باوجود کہ صباح الدین نے عمر طبعی پائی تھی، پھر بھی ان کا علمائے تاریخ اور اردو کی آراستہ بزم سے روپوش ہو جانا زبان اور ملت دونوں ہی کے لیے ایک دردناک سانحہ ہے:

فروغ شمع جو اب ہے رہے گا صبحِ محشر تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

علامہ شبلی نعمانیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ نے جو شمعیں روشن کی تھیں، ان کی تابناکیوں کو قائم رکھنا کچھ آسان نہ تھا۔ تاریخی دستاویزیں جو انھوں نے ہمیں عطا کی ہیں، وہ ابدا لآباد تک گمراہ مصنفین اور نام نہاد مؤرخین کی غلط بیانیوں پر احتجاج کرتی رہیں گی۔ تاریخی واردات سے کہیں زیادہ اسلامی ثقافت کا یہ تاج محل روشن رہا کرے گا۔ یہ وہ شالامار ہے جس کی روش رہنمائی کرتی رہے گی۔ ہاں، اب وہ پیوند خاک ہو چکے ہیں مگر ان کے کارنامے زندہ جاوید ہیں۔ رومی [۶۹] نے سچ کہا ہے: ع

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجو
در سینہ ہائے مردمِ عارف مزار ماست

حواشی و تعلیقات:

۱۔ Bonn University

۲۔ Peradenya University

۳۔ مختصر حالات کے لیے دیکھیے: خواجہ محمد زکریا، پروفیسر (مدیر عمومی)، تاریخ مسلمانان پاکستان و ہند، اردو ادب (جلد چہارم)، ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء، طبع دوم، پنجاب یونیورسٹی ۲۰۱۰ء، ص ۲۷۱-۲۷۲؛ جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود (علامہ اقبال کی مکمل سوانح حیات) سنگ میل/ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، بار دوم، ۲۰۰۸ء، ص ۵۰۸

۴۔ Sharif Al Mujahid, *Quaid-i-Azam: Studies in Interpretation*, Quaid-i-Azam

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شائستہ خان (مرتب)، اسرار خودی (فراموش شدہ اڈیشن)، مکتبہ Academy, Karachi, 1981, p.688; جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء، ص ۱-۴ (متن)، دیباچہ مرتب، ص ۱۳؛ زندہ رود، ص ۵۰۸؛ عطاء اللہ، شیخ (مرتب)، اقبال نامہ، مجموعہ مکاتیب اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۵۱۲

۵۔ Sharif Al Mujahid, p.508

۶۔ محمد راشد شیخ، علامہ عبدالعزیز میمن، سوانح اور علمی خدمات، قرطاس پبلشرز، کراچی، ۲۰۱۱ء، ص ۳۱۷-۳۱۸؛ حسن عباس، سید، (پیشکش و ترتیب)، مکتوبات مشفق خواجہ بنام مختار الدین احمد، مغربی پاکستان اکادمی، لاہور، ت ن، ص ۳۳۷، حاشیہ ۲

۷۔ ناشر: ادب نما، کراچی، ۲۰۰۱ء۔ کتاب ہٰذا راقم کو فاضل گرامی جناب محمد راشد شیخ کی عنایت سے دیکھنے کو ملی، جس کے لیے راقم ان کا انتہائی سپاس گزار ہے۔ تمہید ہٰذا میں مذکور بیشتر معلومات اسی کتاب پر مبنی ہیں۔

۸۔ ملاحظہ ہو، مکتوبات اختر امام، ص ۵۶ و ۶۸

۹۔ سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴ء - ۱۹۵۳ء)، ممتاز عالم دین، محقق، ادیب، اور متعدد عالمانہ آثار کے مصنف، جن میں سیرت النبیؐ، ارض القرآن، سیرت عائشہؓ، خطبات مدراس، حیات امام مالکؒ، خیام اور حیات شبلی جیسی وقیع کتب شامل ہیں۔ مولانا شبلی کی وفات کے بعد آپ نے دار المصنفین اعظم گڑھ کی علمی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی (۱۹۱۵ء - ۱۹۵۰ء)، اور نہ صرف مولانا مرحوم کے ادھورے منصوبوں کو مکمل کیا جن میں سرفہرست سیرت النبیؐ تھی بلکہ معارف جیسے مقتدر ماہوار مجلّے کی نیو بھی رکھی، جو اب تک جاری ہے؛ جون ۱۸۵۰ء میں ہجرت کر کے پاکستان آ گئے جہاں انھیں زیر ترتیب آئین پاکستان کے اسلامی پہلوؤں پر نو تشکیل شدہ تعلیمات اسلامی بورڈ کا سربراہ نامزد کیا گیا۔ سید حسام الدین راشدی (متوفی: ۱۹۸۱ء) نے مقالات راشدی (مرتبہ غلام محمد لاکھو، انسٹیٹیوٹ آف سینٹرل اینڈ ویسٹ ایشین سٹڈیز، جامعہ کراچی، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۷۱-۳۷۴) میں کراچی میں مولانا کے آخری ایام کی درد انگیز تصویر کھینچی ہے۔ مولانا کے بارے میں مزید معلومات کے لیے دار المصنفین اعظم گڑھ کی مندرجہ ذیل مطبوعات ملاحظہ ہوں: مولانا سید سلیمان کی دینی و علمی خدمات از سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف کا مطالعہ از سید صباح الدین عبدالرحمٰن، اور حیات سلیمان از شاہ معین الدین احمد ندوی۔

۱۰۔ یعنی 'بوہرے'

۱۱۔ Albert Einstein آلمانی الاصل، نوبل انعام یافتہ (۱۹۲۱ء)، امریکی ماہر طبیعیات نظری، بعد چہارم ایٹمی قوت اور نظریہ اضافیت کے بارے میں اس کے آثار کی بدولت علمی دنیا میں بے شمار تحولات وجود میں آئے اور آ رہے ہیں۔ دیکھیے: فرہنگ فارسی، تالیف محمد معین، انتشارات امیر کبیر، تہران ۱۳۷۱ش، جلد ۵، ۶ (اعلام)

۱۲۔ ۱۸۴۲ء-۱۹۰۸ء، پٹنہ کے ممتاز ماہر قانون اور خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے بانی۔ حالات کے لیے دیکھیے: Salahuddin Khuda Bakhsh and Sir Jadunath Sarkar, *Khuda Bakhsh*, Khuda Bakhsh Oriental Public Libraray, Patna, 1981.

۱۳۔ معارف، جلد ۸۱، نمبر ۶ (دسمبر ۱۹۵۷ء)، ص ۴۶۸-۴۷۶؛ مکتوبات اختر امام، ص ۴۳-۴۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۴۔ ابوالکلام آزاد (متوفی: ۱۹۵۸ء) معروف کانگرسی رہنما، الہلال و البلاغ کے مؤسس ومدیر، غبار خاطر، تذکرہ، ترجمان القرآن اور India Wins Freedom جیسی شہرہ آفاق کتب کے مصنف اور تقسیم ملک کے بعد بھارت کے پہلے وزیر تعلیم۔

۱۵۔ (متوفی: ۲۵۵ھ/۸۶۹ء) صاحب الاصنام، البخلاء (چاپ بیروت)، البیان والتبیین (قاہرہ، ۱۳۱۱ھ)، التاج فی اخلاق الملوک، الحنین الی الاوطان، الحیوان (چاپ بیروت)، المحاسن والاضداد، الرسائل (بہ تصحیح عبدالسلام، قاہرہ، س ن)

۱۶۔ ابوعلی حسن بن رشیق قیروانی، پانچویں صدی ہجری کے معروف ادیب، شاعر، نقاد اور زبان دان، صاحب العمدہ (درنقد شعر)، قراضۃ الذہب فی نقد اشعار العرب، کتاب الشذوذ (درلغت)، وکتاب الانموذج۔ (لغت نامہ دہخدا)

۱۷۔ ابوزید عبدالرحمٰن بن محمد ابن خلدون الاندلسی (۷۳۲-۸۰۸ھ/۱۳۳۲-۱۴۰۶ء)، معروف مؤرخ وفلسفی صاحب کتاب العبر ودیوان المبتدأ والخبر فی ایام العرب والعجم والبربر، جس کا مقدمہ ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے اور اپنی اہمیت کے پیش نظر اردو، فارسی اور انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ دیکھیے: فرہنگ فارسی (اعلام)

۱۸۔ مطبوعہ قاہرہ، ۱۳۱۱ھ

۱۹۔ ابوعلی اسمٰعیل ابن القاسم القالی البغدادی (متوفی: ۳۵۶ھ/۹۶۷ء) صاحب الامالی (دارالکتب المصریہ، قاہرہ، ت ن) و ذیل الامالی (دارالکتب المصریہ، قاہرہ، ت ن)

۲۰۔ المبرد، ابوالعباس محمد ابن یزید العزدی البصری (متوفی: ۲۸۵ھ/۸۹۸ء) صاحب الکامل (دارالعہد الجدید، قاہرہ، ت ن)، الفاضل (بہ تصحیح عبدالعزیز المیمنی) (دارالکتب المصریہ، قاہرہ، ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۶ء)، والمقتضب

۲۱۔ ابن قتیبہ الدینوری المروزی، ابومحمد عبداللہ بن مسلم (۲۱۳-۲۷۶ھ/۸۲۸-۸۸۵ء)، صاحب ادب الکاتب (دارالکتب العلمیہ، قاہرہ، ۲۰۰۳ء)

۲۲۔ Brussels University, Belgium

۲۳۔ Jean-Jacque Rouseau (1712ء-1778ء) عظیم فرانسیسی مصنف، مفکر اور موسیقار جس کے افکار نے انقلاب فرانس سے پہلے اور بعد میں وہاں کی اجتماعی، سیاسی اور معاشی زندگی پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔

۲۴۔ Valadimir Lenin (1870ء-1924ء) روسی کمیونسٹ پارٹی کا بانی، بولشویک انقلاب کا سرکردہ رہنما اور سوویت سٹیٹ کا معمار اور پہلا سربراہ۔

۲۵۔ مولانا محمد شبلی نعمانی (۱۲۷۴ھ-۱۳۳۲ھ/۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء)، برعظیم کے ممتاز عالم، محقق، ادیب، شاعر، الفاروق، سیرت النعمان، سیرت النبیؐ (پہلے دو حصے)، علم الکلام، الکلام، الغزالی، موازنۂ انیس ودبیر، شعرالعجم (۵ حصے)، سفرنامہ مصر وروم وشام، اور متعدد دیگر اردو، فارسی اور عربی کتب کے مصنف، ندوۃ المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ کے بانی (حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو، طبع سوم، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۶ء، ص ۷۱۸-۹۰۰)۔ یہاں ظاہراً مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر تالیف سید صباح الدین عبدالرحمٰن، از مطبوعات ندوۃ المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، مراد ہے۔ مولانا شبلی کے بارے میں مزید معلومات کے لیے دیکھیے: ندوہ ہی کی درج ذیل مطبوعات:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حیاتِ شبلی از سید سلیمان ندوی، شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں از سید شہاب الدین دیسوی، اور Mohammad Shibli Numani by Jawaid Ali Khan (ICS)۔

۲۶۔ پرنسپل شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڑھ اور مولانا شبلی کی نواسی تحسین جہان بنت حامد حسن نعمانی (۱۸۸۲ء-۱۹۴۲ء) کے شوہر، جن کے ساتھ موصوفہ کی شادی ۱۹۴۰ء میں انجام پائی۔

۲۷۔ کمیونزم، اشتراکیت (المنجد)

۲۸۔ (کرنل) معمر القذافی (متولد ۱۹۴۲ء)، ۱۹۶۹ء میں ایک پرامن فوجی انقلاب کے ذریعے برسر اقتدار آئے۔ ۲۰۱۱ء کے آغاز میں مصر اور تیونس کے انقلابات کے بعد لیبیا میں بھی حکومت مخالف احتجاجات کا سلسلہ شروع ہو گیا جو کھلم کھلا بغاوت پر منتج ہو، جس کی سرپرستی اور حمایت بعد ازاں نیٹو (NATO) نے سنبھال لی اور باغیوں کی حمایت میں لیبیا کی سرکاری فوج اور دیگر تنصیبات پر فضائی حملے شروع کر دیے۔ ۲۰ راکتوبر ۲۰۱۱ء کو قذافی باغیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر مارا گیا اور اس طرح اس کے ۴۱ سالہ دور حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

۲۹۔ (1818-1883) Karl Heinrich Marx، اشتراکیت پسند جرمن یہودی، مؤرخ، صحافی، فلسفی، اور ماہر اقتصادیات، اور مکتب مارکسزم کا بانی۔

۳۰۔ امت عربیہ ایک امت ہے اور ہمیشہ کے لیے ایک پیغام رکھتی ہے۔

۳۱۔ ہم ایک سوشلسٹ قوم ہیں۔

۳۲۔ ہم ہر شے سے پہلے عرب ہیں۔

۳۳۔ غوث الاعظم محی الدین حضرت شیخ عبدالقادر الجیلانیؒ (۴۷۱-۵۶۱ھ)، بانی سلسلہ قادریہ۔ حالات کے لیے ملاحظہ ہو: نفحات الانس من حضرات القدس، تألیف نور الدین عبدالرحمٰن جامی، مقدمہ، تصحیح و تعلیقات از دکتر محمود عابدی، انتشارات اطلاعات، تہران، ۱۳۷۰ش، ص ۵۰۷-۵۱۱

۳۴۔ امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت الخزازؒ (۸۰-۱۵۰ھ) از اعظم فقہاء، مذہب حنفی کے بانی۔ حالات کے لیے دیکھیے: کشف المحجوب، اثر علی بن عثمان ہجویری المعروف داتا گنج بخش، مقدمہ و تصحیح و تعلیقات از دکتر محمود عابدی، انتشارات سروش، تہران ۱۳۸۳ش، ص ۱۴۳-۱۴۷؛ ۱۳-۷؛ شبلی نعمانی، سیرت النعمان، ایم ثناء اللہ خان اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۹ء؛ محمد طاہر منصوری و عبدالحیٔ ابڑو (مرتبین)، امام ابوحنیفہ: حیات، فکر اور خدمات، ادارۂ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء

۳۵۔ ابوالمغیث الحسین بن منصور الحلاجؒ (مقتول ۳۰۹ھ)۔ مزید معلومات کے لیے ملاحظہ ہو: کشف المحجوب، ص ۲۲۹-۲۳۳؛ ۶۴-۷

۳۶۔ ابوبکر دُلف بن جحدر الشبلیؒ (متوفی: ۳۳۴ھ)، اصلاً ماوراء النہر کے شہر اسروشنہ کے نواحی گاؤں شبلہ کے رہنے والے تھے۔ آپ کا شمار اکابر مشائخ میں ہوتا ہے۔ بعض لوگ آپ کو دیوانہ خیال کرتے تھے۔ آپ سے اشعار بھی منسوب کیے جاتے ہیں۔ دیکھیے: دیوان ابوبکر شبلی، با تصحیح و تحقیق کامل از مصطفیٰ شیبی، بغداد، ۱۳۸۶ش۔ مزید معلومات کے لیے: کشف المحجوب، ص ۲۳۶-۲۳۷؛ ۶۹-۷۷۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳۷۔ ابوعبداللہ امام احمد بن حنبلؒ (۱۶۴-۲۴۱ھ)، اصلاً مرو سے تعلق تھا، بغداد میں متولد ہوئے، امام شافعی کے شاگرد تھے۔ آپ کو ہزاروں حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ ملاحظہ ہو: کشف المحجوب، ص ۱۷۸-۱۷۹؛ ۳۴۲-۳۴۷

۳۸۔ عباسی خلیفہ ہارون الرشید (۱۷۰ھ-۱۹۳ھ) کا فرزند، جو اپنے بڑے بھائی امین (۱۹۳ھ-۱۹۸ھ) کے بعد تخت خلافت پر بیٹھا اور ۱۹۸ھ-۲۱۸ھ تک حکومت کی۔

۳۹۔ ۲۴ جلدوں پر مشتمل مجموعہ احادیث، مرتبہ امام احمد بن حنبل۔ دیکھیے: فرہنگ فارسی (اعلام)

۴۰۔ شمس الدین ابوالعباس احمد بن ابراہیم برمکی اربلی شافعی (۶۰۸-۶۸۱ھ)، صاحب وفیات الاعیان وابناء الزمان (در ۸ جلد، س ن) کا شمار اپنے عہد کے معروف علماء وقضاۃ میں ہوتا تھا۔ دیکھیے: فرہنگ فارسی (اعلام)

۴۱۔ اصل: ''محرم''

۴۲۔ آسوان ڈیم یا سد العالی کی تعمیر دریائے نیل پر ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیان عمل میں آئی اور مصری معیشت پر اس کے بڑے خوشگوار اثرات مرتب ہوئے۔

۴۳۔ اصل نام القصور تھا، جو پہلے مختصر ہو کر الاُقصُر ہوا اور اب لکسَر بن چکا ہے۔ وسیع وعریض علاقے پر پھیلے ہوئے اپنے زمانہ ماقبل مسیح کے تاریخی آثار کی وجہ سے یہ شہر ''دنیا کا بیرونِ در عجائب گھر'' ہونے کی شہرت رکھتا ہے اور یہاں اطراف واکناف عالم سے ہر سال لاکھوں سیاح کھنچے چلے آتے ہیں، جن کی سہولت کے لیے یہاں ایک بین الاقوامی ہوائی اڈہ بھی تعمیر کیا گیا ہے۔

۴۴۔ John D. Rockefeller (1937ء-1939ء)، معروف امریکی صنعت کار، Standard Oil Co.(1872ء) کا بانی، جو بین الاقوامی سطح پر مختلف علمی منصوبوں کی سرپرستی کی وجہ سے مشہور ہے۔

۴۵۔ فراعنہ مصر میں اس نام کے نو بادشاہ گذرے ہیں لیکن یہاں Ramses II مراد ہے، جسے رامسیس اعظم بھی کہا جاتا ہے۔ وہ ۱۳۱۳ ق م میں پیدا ہوا اور ۱۲۷۹ سے ۱۲۱۳ ق م میں اپنی وفات تک مصر کے سیاہ وسفید کا مالک رہا۔

۴۶۔ Tripoli، لیبیا کا دارالحکومت۔

۴۷۔ ۴۱ فصّلت: ۳۴، (ترجمہ): پس ناگہاں وہ شخص تیرے اور جس کے درمیان عداوت ہے، یوں بن جائے گا گویا تمھارا جانی دوست ہے۔

۴۸۔ ۹ توبہ: ۱۰۵، (ترجمہ): اور فرمایئے عمل کرتے رہو، پس دیکھے گا اللہ تعالیٰ تمھارے عملوں کو (اور دیکھے گا) اس کا رسولؐ اور مومنین۔

۴۹۔ ثقافتی انقلاب کسی خلا سے نہیں نکلتا، یہ تو تیسرے نظریے کی بنیاد پر ہتھیار بند سپاہیوں کے پہرا چوکی سے جاری ہوتا ہے اور یہ انسان کا کام نہیں، یہ تو اسلام کے نفاذ کی طرف واپسی ہے۔

۵۰۔ ۳ آل عمران: ۱۰۳، (ترجمہ): اور مضبوطی سے پکڑلو اللہ کی رسّی، سب مل کر اور جدا جدا نہ ہونا۔

۵۱۔ صفائی ایمان کا حصہ ہے۔

۵۲۔ ۲ البقرہ: ۱۸۸، (ترجمہ): اور نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے۔

۵۳۔ سچ فرمایا اللہ تعالیٰ نے، جو عظیم ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۵۴۔ ابن الطقطقی، محمد بن علی بن طباطبا (متوفی: ۷۰۱ھ/۱۳۰۰م)، الفخری فی الآداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ، قاہرہ، ۱۹۲۷م۔

۵۵۔ اصل: '' سلمان''۔ساتواں خلیفہ بنی امیہ سلیمان بن عبدالملک (۹۶ھ -۹۹ھ / ۷۱۵ - ۷۱۷ء) مراد ہے۔ دیکھیے: فرہنگ فارسی (اعلام)

۵۶۔ دوسرا اموی خلیفہ (۶۰ھ - ۶۴ھ/ ۶۸۰ء- ۶۸۳ء) جس کے عہد میں واقعہ کربلا پیش آیا۔

۵۷۔ آٹھویں اموی خلیفہ (۹۹ھ -۱۰۱ھ/۷۱۷ء-۷۲۰ء) جنھوں نے حضرت علیؓ کے خلاف نماز کے بعد رائج سب وشتم کا سلسلہ ختم کیا۔وہ اپنے نیک کارناموں کی وجہ سے پانچویں خلیفہ راشد بھی کہے جاتے ہیں۔

۵۸۔ جمہوریہ گابون ۱۹۶۰ء میں فرانسیسی تسلط سے آزاد ہوا، ۱۹۶۷ء میں بونگو صدر جمہوریہ کے طور پر برسراقتدار آئے اور چالیس برس سے زیادہ حکومت کے بعد جون ۲۰۰۹ء میں تہتر برس کے سن میں فوت ہوئے۔۱۹۷۳ء میں اسلام قبول کیا اور الحاج عمر بونگو کے نام سے پہچانے گئے۔

۵۹۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا۔ترک اس وقت بہت کمزور تھے لیکن اس کے باوصف جان پر کھیل گئے۔۱۹۱۲ء میں ایک چودہ سالہ کم سن بچی فاطمہ بنت عبداللہ اسی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہوئی۔تلمیحات اقبال از سید عابد علی عابد، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۵۹ء، حصہ اردو، ص ۵۹

۶۰۔ مولانا کا یہ مقالہ غالباً ۱۳ر نومبر ۱۹۱۲ء کو الہلال میں شائع ہوا۔دیکھیے: تلمیحات اقبال، حصہ اردو، ص ۵۹، فٹ نوٹ ۱

۶۱۔ کلیات اقبال (اردو)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، چاپ ہشتم، ۱۹۸۹ء، ص ۲۱۴-۲۱۵

۶۲۔ ''حضور رسالتمآب میں''، کلیات اقبال (اردو)، ص ۱۹۷

۶۳۔ فیصل بن عبدالعزیز آل سعود (متولد: ۱۹۰۶ء)، سعودی فرمانروا (۱۹۶۴ء -۱۹۷۵ء) جو اتحاد عالم اسلام ،اشتراکیت کی مخالفت اور فلسطینیوں کے حقوق کی حمایت کے باعث اسلامی دنیا میں غیر معمولی طور پر مقبول تھے۔مارچ ۱۹۷۵ء میں اپنے ایک بھتیجے کے ہاتھوں پراسرار طور پر قتل ہوئے۔

۶۴۔ امام ابوالعباس، احمد بن یحییٰ بن جابر بن داؤد البلاذری، تیسری صدی ہجری کے معروف مؤرخ اور جغرافیہ دان۔

۶۵۔ *Kitab Futuh-al-Buldan*, ed. M. J. de Goeje, Leiden, *1870*ء, *Cairo*ء*1901*. کتاب ہٰذا کا انگریزی ترجمہ دو حصوں میں کولمبیا یونیورسٹی کی جانب سے شائع ہو چکا ہے۔پہلے حصے کا ترجمہ (1916ء) Philip Khuri Hitti، اور دوسرے حصے کا ترجمہ (1924ء) Francis Clark Murgotten نے کیا۔

۶۶۔ ترجمہ: اس جزیرہ کا نام وہاں کی عورتوں کی خوبصورتی کی بناء پر جزیرۃ الیاقوت رکھا گیا۔

۶۷۔ سید عشرت امام، جو مکتوبات اختر امام کی اشاعت (۲۰۰۱ء) کے وقت سری لنکا ہائی کورٹ کے جج کے منصب پر فائز تھے۔

۶۸۔ ۲ البقرہ: ۱۵۹۔ہم اللہ کے لیے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

۶۹۔ رومیؔ سے اس شعر کا انتساب محلِ نظر ہے۔

© rasailojaraid.com